© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

ادار یہ

فکر فراہی۔پس منظر اور محرکات

اشتیاق احمد ظلی

مسلم معاشرہ میں قرآن مجید کو جب تک حاکمیت کا وہ مقام حاصل رہا جس کا وہ اللہ کی کتاب ہونے کی حیثیت سے مستحق تھا، اس کی تعلیمات کو مسلمانوں کی زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل رہی، ان کی فکر ونظر کے پیمانے اسی کی تعلیمات سے ماخوذ ومستفاد اور ان کے علم ودانش کے چراغ اسی کے نور سے مستنیر رہے، اس وقت تک یہ امت ان تمام برکات سے بہرہ مند رہی جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے فرماں بردار بندوں سے وعدہ کیا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

ولو أن اھلَ القُریٰ آمَنُوا و اتَّقَوا لَفَتَحْنَا عَلَیْھم بَرَکَاتٍ مِّنَ السَّماءِ وَالْاَرْضِ (الاعراف/۹۶)	اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقوی اختیار کرتے تو ہم ان پر زمین وآسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

یہ وعدہ الٰہی ان کے حق میں پورا ہوا اور یہ واقعہ ہے کہ ان کے لئے آسمان نے اپنی برکتوں اور زمین نے اپنے خزانوں کے دروازے کھول دئے تھے۔اس عہد مسعود کے تابناک نقوش تاریخ کے صفحات میں اب بھی محفوظ ہیں۔جیسے کچھ دنوں کے لئے جنت اپنی نعمتوں کے ساتھ زمین پر اتر آئی تھی۔یہ تاریخ انسانی کا سب سے روشن دور تھا۔توحید الٰہی اور وحدت انسانیت کے یہ نقیب دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ان کی سطوت واقبال کا پرچم چار دانگ میں لہرایا اور ان کی فتح مندیوں کے سیلاب کو دنیا کی عظیم ترین طاقتیں بھی روکنے میں ناکام رہیں۔ان کے زیر سایہ ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسی تہذیب پروان چڑھی جو اعلیٰ ترین انسانی اور اخلاقی اقدار کی حامل تھی اور اس زمین پر رہنے بسنے والے مظلوم و مقہور انسانوں کے لئے ظلم و جبر کی کڑی دھوپ میں سایہ رحمت کی مصداق تھی، اپنے اور بیگانے سب کے ساتھ عدل و قسط اس کا شعار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں جہاں گئے وہاں کے مجبور و مظلوم باشندوں نے نجات دہندہ کی حیثیت سے ان کا استقبال کیا اور تاریخ شاہد ہے کہ انہیں مایوسی نہیں ہوئی۔ جس خطہ زمین پر ان پاک نفوس کے قدم پڑ گئے اس کی قسمت سنور گئی اور جن پر ان کی نگاہ پڑ گئی ان کی زندگی بدل گئی۔ یہ اس بابرکت زمانے کی بات ہے جس کے بارے میں سرور کائنات محمد عربی ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا 'خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم'

لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس صورت حال میں تبدیلی کے آثار صاف طور سے محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک پیچیدہ تاریخی عمل اور ردّ عمل کی داستان ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس صورت حال کے لئے بڑی حد تک وہ بیرونی نظریات اور اثرات ذمہ دار تھے جو غیر محسوس طور پر جسد ملی میں سرایت کر گئے تھے۔ اسلام اور اسلامی حکومت کی توسیع کے نتیجہ میں بہت سی غیر عرب اقوام اسلام کے حلقہ اثر میں داخل ہوئیں۔ ان میں سے بیشتر نے اسلام قبول کر لیا البتہ کچھ نے ذمی کی حیثیت سے اسلامی حکومت کی ماتحتی میں رہنا قبول کیا۔ اس طرح ان دونوں قسم کی اقوام سے مسلمانوں کے روابط قائم ہوئے اور ان کے وسیلہ سے غیر اسلامی نظریات، خیالات اور روایات کے اسلام کے جسد اجتماعی میں نفوذ کی راہ ہموار ہوئی۔ چنانچہ جب اسلام اقصاء عالم میں پھیلا اور مختلف ملکوں اور علاقوں میں رہنے بسنے والوں نے اسے قبول کیا اور اسلام کی عالم گیر برادری سے منسلک ہو گئے تو بہت سے غیر اسلامی افکار اور نظریات جو ان اقوام میں مقبول اور رائج رہے تھے اور اسلامی نظام اقدار اور مزاج سے میل نہیں کھاتے تھے، غیر محسوس طریقہ سے دھیرے دھیرے ملت کے جسد اجتماعی میں شامل ہو گئے اور اس میں اس طرح رچ بس گئے کہ ان کی شناخت اور ان کے اثرات بد سے مسلم معاشرہ کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تطہیر آسان نہ رہی خصوصاً وہ عناصر جو مذہب کا لبادہ اوڑھ کے آئے تھے۔ ایران اور وسط ایشاء میں زردشت اور بدھ کی تعلیمات کا غیر معمولی اثر تھا۔ تقشّف، دنیا سے دوری اور بیزاری اور اس سے کنارہ کشی کی نسبت سے بہت سے نظریات اور میلانات انہی راستوں سے مسلم معاشرہ میں داخل ہوئے اور تصوف کے وسیلہ سے اسلامی مذہبیت میں غیر معمولی حد تک دخیل ہو گئے۔ وقت گذرنے کے ساتھ وہ اسلامی تصور مذہب کا ایسا مضبوط اور محکم حصہ بن گئے کہ ان کے بارے میں کسی شک وشبہ کا اظہار مذہب سے دوری کی علامت تصور کیا جانے لگا اور یہی اسلام کی اصل اساس اور روح سمجھے جانے لگے۔

اسی طرح عباسی عہد میں یونان اور دوسری اقوام کے علوم مسلمانوں کی دست رس میں آئے۔ یونانی فلسفہ کو خصوصاً مسلمانوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس میدان میں نہ صرف انہوں نے یونان کے علمی اور عقلی ورثہ کی بازیافت اور پھر اس کی بھرپور حفاظت کی بلکہ اس کی ترویج اور ترقی کے باب میں ان کے اپنے اکتسابات غیر معمولی نوعیت اور اہمیت کے حامل ہیں۔ یونانی فلسفہ جو ایک وقت میں مسلمان حکماء کے ذہن ودماغ کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب ہو گیا تھا ایک ایسا فلسفہ ہے جو انسانی عقل کی روشنی میں حقیقت کی اصل اور اس کی ماہیت تک پہونچنے کا دعوی کرتا ہے۔ چنانچہ فلسفہ یونان کے نظریات اور اس کی تعلیمات فطری طور پر اس نظام زندگی اور اس کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے نظام اخلاق واقدار سے متصادم ہوں گے جو وحی الٰہی کو علم کا سب سے اعلیٰ، اشرف اور بے خطا ذریعہ سمجھتا ہو اور اسی سے مستفاد اور مستنبط اصول ونظریات کی روشنی میں معاشرہ کی تنظیم وتشکیل کے لئے کوشاں ہو اور اسی کی پیروی میں انسانیت کی نجات کو منحصر سمجھتا ہو۔ چونکہ دونوں کے بنیادی عناصر میں اساسی اختلاف ہے اس لئے ان کے درمیان توافق اور مصالحت کی کوششوں سے محض پیچیدگیوں میں اضافہ ہی کا امکان ہو سکتا ہے۔ عقل اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے لیکن اس کے بھی حدود ہیں، ایک مقام سے آگے اس کو بھی اپنی لاچاری اور نارسائی کا احساس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتا ہے اور حقیقت تک رسائی کے لئے وہ بھی وحی الٰہی کی رہنمائی کی محتاج ہے۔

مسلم اہل علم اور دانش وروں کے درمیان فلسفہ یونان کے نفوذ اور مقبولیت کے باعث جس طرح کے مسائل نے جنم لیا اور ان کے نتیجہ میں مسلم معاشرہ جن حالات سے دوچار رہا اس کی تفصیلات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں اور ہمارے لئے سامان عبرت فراہم کرتی ہیں۔ اس کے زیر اثر جن دوراز کار امور میں مسلمانوں کے بہترین دماغوں نے اپنی صلاحتیں صرف کیں ان میں سے بہت سے مسائل کو عہد جدید کا ذہن دماغی ورزش سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، تقدیر اور اس طرح کے دوسرے مسائل پر جس طرح کا مباحثہ بلکہ مناقشہ ان دنوں عام تھا آج اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ اسی بحث کے ایک شاخسانہ کے طور پر قرآن مجید کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کی بحث نے جو ناگوار اور تکلیف دہ صورت حال اختیار کی اور جس کے نتیجہ میں امام احمد بن حنبلؒ جیسی جلیل القدر شخصیت کو قید و بند اور ابتلاء وآزمائش کے جن مراحل سے گذرنا پڑا آج اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مسئلہ جو ایک وقت میں امت کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا آج پڑھے لکھے مسلمانوں میں کتنے لوگ اس سے ابتدائی درجہ کی واقفیت بھی رکھتے ہیں۔ تاریخ اسلام میں فکری پہرہ داری کی ابتداء بھی یہیں سے ہوتی ہے۔ اس سے پہلے سیاسی اسباب کی بنا پر تعزیر و تشدید کی مثالیں تو ضرور موجود ہیں لیکن علمی وفکری اختلاف رای کی وجہ سے کبھی کسی کو سزا کا مستحق نہیں سمجھا گیا۔

اس صورت حال سے عہدہ براہونے کے لئے علماء اسلام نے علم کلام کی بنیاد ڈالی۔ لیکن یہ ایک انتہاء سے دوسری انتہاء کی طرف سفر تھا۔ جہاں معتزلہ ہر چیز کو عقل کی ترازو میں تولتے تھے اور جو چیز بھی فلسفہ کے فراہم کردہ معیار پر پوری نہ اترے اسے درخور اعتناء نہیں سمجھتے تھے وہیں متکلمین دوسری انتہاء پر چلے گئے۔ اگرچہ اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے اور مخالفین کے دلائل کی تردید کے لئے انہوں نے منطق وفلسفہ کا بھرپور استعمال کیا لیکن انہوں نے دینی اور روحانی امور میں عقل کے عمل دخل کو یکسر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ختم کر دیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی اپنی کتاب "فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں" لکھتے ہیں "مسلمان متکلمین میں سب سے بڑا گروہ شاعرہ کا ہے۔ مسلمانوں کا بہت بڑا گروہ انہیں کا پیرو ہے۔ یہ گروہ بھی دین میں عقل کے کسی دخل کا قائل نہیں، وہ دین میں حکمت کا بھی قائل نہیں۔ نہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ خدا کسی کام کو کسی علت، کسی حکمت یا کسی سبب کی بنا پر کرتا ہے۔ ان کے نزدیک خیر وشر کے معاملات میں انسان کی حیثیت ایک مادر زاد نابینا کی ہے جو ہر وقت عصا کش کا محتاج ہے۔" اس افراط وتفریط کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے فطری طریق استدلال سے دوری ہوتی چلی گئی اور انسان کے اردگرد آفاق وانفس کی پھیلی ہوئی بے شمار نشانیاں جن پر غور وفکر کی دعوت قرآن بار بار دیتا ہے اور جن کے اندر فطرت سلیم کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے بہت کچھ سامان موجود ہے وہ منتہاء نظر نہ رہے۔ اساسی علوم سے دوری اور مابعد الطبیعاتی مباحث میں رغبت بڑھتی گئی۔ علوم کے میدان میں قافلہ سالاری کے منصب سے محرومی ومعزولی اور ہمہ گیر علمی زوال اور انحطاط کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

ان سب منفی عوامل کے باوجود اس میں شبہ نہیں کہ ہر دور میں علماء محققین قرآنی علوم کی خدمت اور قرآنی معارف کی توسیع واشاعت کے لئے اپنی زندگیاں وقف اور اپنی ساری توانائیاں صرف کرتے رہے۔ ان کی ان مساعی جمیلہ کے نتیجہ میں قرآنیات کے موضوع پر تحقیقات وتصنیفات کا ایسا عظیم الشان ذخیرہ وجود میں آیا جس کی انسانی تاریخ میں کوئی مثال نہیں۔ لیکن ظاہر ہے یہ تحقیقات وتصنیفات بھی ان افکار ورجحانات سے یکسر لاتعلق نہیں رہ سکتی تھیں جو ان ادوار کے علمی حلقوں میں معروف ومتداول تھے اور ہر علمی مجلس میں بحث وتمحیص کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ کتنی تفسیریں ہیں جو فلسفیانہ اور کلامی بحثوں اور ایک دوسرے کے ردّ وقدح سے بھری ہوئی ہیں اس حد تک کہ حافظ جلال الدین سیوطیؒ نے امام فخر الدین رازیؒ کی شہرہ آفاق تفسیر "تفسیر کبیر" کے بارے میں بعض علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ تفسیر کبیر میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سب کچھ ہے صرف تفسیر نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ رائے مبنی برانصاف نہیں ہے اور نہایت مبالغہ آمیز ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس تفسیر میں فلسفیانہ اور متکلمانہ مباحث جزء غالب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان عظیم الشان تفسیری خدمات سے جن کی قدرو قیمت مسلم اور شک وشبہ سے بالاتر ہے، جتنا اور جیسا کچھ فائدہ اصلاح امت کے میدان میں ہونا چاہئے تھا وہ حاصل نہ ہوسکا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کے مباحث سے استفادہ آسان نہیں بالخصوص عہد حاضر کے جدید ذہن کے لیے یہ مباحث جو کبھی علم وتحقیق کی دنیا میں بڑی اہمیت کے حامل تصور کئے جاتے تھے دوراز کار محسوس ہوتے ہیں، فلسفیانہ اور متکلمانہ مباحث کے طومار میں خالص قرآنی تعلیمات کی روح دب سی جاتی ہے، چنانچہ قرآن مجید سے صحیح استفادہ اور اس کی تعلیمات کی بالادستی قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انہیں ان طول طویل اور پیچیدہ مباحث کی گرفت سے آزاد کیا جائے اور اس پر غور وفکر کے فطری طریقہ کو پھر سے رائج کیا جائے ہے جو قرن اول کا نشان امتیاز تھا۔

اس کے بعد کے ادوار میں اگر چہ جہاں تہاں طباعی اور اوریجنالٹی کی مثالیں ضرور ملتی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی صدیوں پر محیط اس زمانہ میں مسلمانوں کی علمی پیش رفت کے میدان میں بڑی حد تک سناٹا نظر آتا ہے۔ اگلے وقتوں میں علماء محققین جو تحقیقات کر چکے تھے، جو معیار اور مقدار دونوں لحاظ سے غیر معمولی نوعیت کی حامل تھیں، شروح اور مختصرات کی شکل میں بار بار انھیں کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے اور آنکھیں کسی نئی تحقیق اور کان علم وفن کی دنیا سے کسی نئی آواز کے لئے ترس جاتے ہیں۔ علامہ شبلیؒ اسی صورت حال کی تصویر کشی کرتے ہوئے امام طبریؒ (متوفی ۳۱۰ھ) کی شہرہ آفاق تفسیر کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "در حقیقت ایک ہی نغمہ ہے جو مختلف سازوں سے ادا ہوتا ہے۔ آٹھ سو برس کی وسیع مدت میں ہزاروں لاکھوں اہل فن پیدا ہوئے لیکن ان تمام قالبوں میں ایک ہی روح کام کررہی ہے۔" یہ کچھ تفسیر کے ساتھ موقوف نہیں کم وبیش یہی صورت حال دوسرے علوم کے سلسلہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ بلاشبہ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تپتے ریگزار میں نخلستان بھی ہیں جہاں تازہ ہوا کا جھونکا روح کو تازگی اور بالیدگی سے ہم کنار کرتا ہے لیکن بالعموم ان کے درمیان زمان ومکان کے طویل فاصلے حائل ہیں۔

برصغیر کو عام طور پر عالم اسلام کا حاشیہ (Periphery) تصور کیا جاتا رہا ہے جہاں عالم اسلام کے مختلف گوشوں سے علمی، فکری اور تہذیبی دھارے آتے اور جذب ہوتے رہے ہیں اور یہاں کے فکر ونظر کے پیمانوں کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ آج کی علمی دنیا میں یہ خیال عام ہے کہ اس خطہ ارض کے علماء، محققین اور مصلحین کے افکار، تحقیقات اور مساعی کے نتائج زیادہ تر اسی علاقہ تک محدود رہے اور عالم اسلام کے دوسرے گوشوں میں ان کے اثرات کو کم ہی محسوس کیا گیا ہے۔ لیکن علمی دنیا میں مروّج بہت سی دوسری تعمیمات کی طرح یہ بات بھی درست نہیں ہے اور محض ایک مفروضہ ہے۔ علامہ رضی الدین صغانیؒ سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ تک علماء، محققین اور مصلحین کا ایک طویل سلسلہ ہے جو ہندوستان کی مسلم تاریخ کے ہر دور میں سامنے آتا رہا ہے اور ان کے افکار، نظریات اور تحقیقات کے اثرات برصغیر سے باہر دور دور تک محسوس کئے گئے ہیں۔ دورِ آخر میں اسی سلسلۃ الذہب کی ایک تابناک کڑی مولانا حمید الدین فراہیؒ (۱۸۶۳۔۱۹۳۰) تھے جن کو علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اللہ کی آیتوں میں سے ایک آیت قرار دیا ہے۔ ان کی وجہ امتیاز یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے خصوصی فہم سے نوازا تھا اور انہیں فہم قرآن کے باب میں ایک انقلاب آفریں فکر پیش کرنے کی سعادت بخشی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ فکر ابھی تک اپنی پوری توانائی، امکانات اور مضمرات کے ساتھ بروئے کار نہیں آسکا ہے۔ آئندہ صفحات میں اس فکر اور صاحب فکر کے بارے میں اٹھنے والے بعض سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا حمید الدین فراہی ۱۸۶۳ء میں ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں پھریہا میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی ابتداء حفظ قرآن سے ہوئی۔ اس کے بعد فارسی زبان وادب کی طرف توجہ کی اور صغر سن ہی میں اس میں ایسا کمال حاصل کیا کہ زمانہ طالب علمی ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں لکھے گئے ان کے ایک قصیدے پر استاذ شبلی مولانا فاروق چریا کوٹی کو متقدمین میں سے کسی شاعر کی تخلیق کا گمان گذرا۔ علوم اسلامیہ کی تحصیل کے لئے انہوں نے اپنے دور کے جید علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان میں ان کے پھوپھی زاد بھائی مولانا شبلی نعمانی، مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری شامل ہیں۔ ان کی تعلیم وتربیت میں سب سے نمایاں حصہ مولانا شبلی کا ہے۔ ان علوم کی تکمیل اوران میں رسوخ حاصل کرنے کے بعد انہوں نے جدید تعلیم کے حصول کی طرف توجہ دی۔

یہ انیسویں صدی کے آخری برسوں کی بات ہے جب مسلمان ۱۸۵۷ء کے جلو میں آنے والی ہمہ گیر تباہی، حکومت سے بے دخلی اور محکومیت کی ذلت میں گرفتار ہونے کی وجہ سے انگریزی تعلیم اور وہ سب کچھ جس کا کوئی تعلق انگریز سے تھا، ان سب سے شدید نفرت کی نفسیات میں مبتلا تھے۔ چنانچہ عام طور پر مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کے خلاف نہایت سخت جذبات پائے جاتے تھے اور اسے شجر ممنوعہ تصور کیا جاتا تھا۔ بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ "اس زمانہ میں انگریزی پڑھنا کفر سمجھا جاتا تھا مگر یہ کفر مولانا نے توڑا۔" واقعہ یہ ہے ان حالات کے تناظر میں یہ ایک غیر معمولی فیصلہ تھا۔ ان کے بھائی اور استاد مولانا شبلی ۱۸۸۳ء میں بحیثیت استاد علی گڑھ سے وابستہ ہو چکے تھے۔ وہاں ان کی موجودگی کے باعث شاید یہ فیصلہ کرنا کسی حد تک آسان ضرور ہو گیا ہوگا۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ اندازہ کرنا ممکن نہیں کہ اس فیصلہ کے پیچھے شبلی کی ترغیب وتشویق کا کتنا دخل رہا ہے۔ مکاتیب شبلی میں ۷ار جولائی ۱۸۸۷ء کا ایک خط موجود ہے جو شبلی نے علی گڑھ سے مولوی سمیع اللہ کو لکھا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

"حمید کو رائے دو کہ فوراً یہاں چلے آئیں ورنہ یہ سال بھی ضائع ہوگا۔ جس قدر ہو سکے جلد آئیں ماموں صاحب کے اگر مگر میں نہ رہ جائیں۔"

قرائن سے واضح ہے کہ یہ مولانا فراہی سے متعلق ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ سوال ہنوز تشنہ جواب رہ جاتا ہے کہ ۱۸۸۷ء میں شبلی انہیں علی گڑھ کیوں بلا رہے تھے اور پھر اس پیش قدمی کا نتیجہ کیا نکلا۔ یہ معلوم ہے کہ مولانا کے ورود علی گڑھ کا سن ۱۸۹۱ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے ۱۸۸۷ء اور ۱۸۹۱ء کے درمیان کے چار سال کہاں گذرے اور اس دوران مولانا کی مصروفیات کیا تھیں شواہد کی غیر موجودگی میں اس سلسلہ میں حتمی طور پر کوئی بات کہنا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ اب شاید یہ معلوم کرنا ممکن نہ ہو کہ اس فیصلہ کے پیچھے کیا اسباب ومحرکات تھے۔ اسباب جو بھی رہے ہوں اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک انقلابی فیصلہ تھا اور اس کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ اس بات میں بھی شبہ نہیں کہ انہیں جس فکری انقلاب کی داغ بیل ڈالنے کی سعادت مبدا فیض کی طرف سے مقدر ہو چکی تھی اس کے لئے ضروری سازوسامان کی فراہمی میں اس کا بھی ایک اہم حصہ تھا۔

اس سلسلہ میں علی گڑھ میں مولانا کا پانچ سال کا قیام بڑی اہمیت کا حامل ہے اور مولانا کے فکری ارتقاء میں اس کا ایک بڑا حصہ ہے۔ مولانا ۱۸۹۱ء میں علی گڑھ آئے اور ۱۸۹۵ء میں یہاں سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ یہ کالج کی تاریخ کا سب سے روشن دور تھا۔ اس وقت کالج کی نگرانی کے لئے سرسید خود موجود تھے۔ لائق اور منتخب روزگار اساتذہ جن میں شبلی اور آرنلڈ جیسے اساطین شامل تھے۔ حوصلہ منداور زندگی کی امنگوں سے سرشار طلبہ۔ سرسید نے مسلمانوں کی زبوں حالی کو دور کرنے، ان کو قعر مذلت سے نکالنے اور ان کو قوموں کے درمیان پھر سے عزت ووقار کے مقام پر فائز کرنے کے لئے جو نسخہ تجویز کیا تھا اس سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن امت مرحومہ کے تئیں ان کی دردمندی، دل سوزی اور اخلاص سے انکار ممکن نہیں۔ سرسید اپنے تجربات، مشاہدات، مطالعہ اور طویل غور وفکر کے بعد اس نتیجہ تک پہونچے تھے کہ جدید تعلیم کے حصول کے بغیر مسلمانوں کی ترقی کا کوئی امکان نہیں ہوسکتا تھا۔ ان کی زندگی کے آخر سال اسی مقصد کے حصول کی جدوجہد سے عبارت ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان کو مسلمانوں کی مذہبی شناخت کا تحفظ بھی بہت عزیز تھا۔ اس کا سب سے واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ زندگی بھر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف ہونے والے مغربی اعتراضات کا بھرپور جواب دیتے رہے۔ اس کی سب سے واضح مثال خطبات احمدیہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بے شمار تحریریں اس بات کی ناقابل تردید

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شہادت پیش کرتی ہیں چنانچہ علی گڑھ تحریک کے پیچھے بنیادی طور پر یہی جذبہ کارفرما تھا کہ کس طرح مسلمانوں کو ان کا کھویا ہوا مقام واپس دلایا جائے اور قوموں کی برادری میں ان کی عزت اور وقار کو بحال کیا جائے، یہ ذکر، فکر اور خیال علی گڑھ کی ہوا اور فضا میں رچا بسا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں علی گڑھ سے سرکاری عہدیدار اور حکام پیدا ہوئے جن کا مطمح نظر بنیادی طور پر حکومتی مناصب تھے وہیں وہاں سے مسلمانوں کے رہنما اور حریت فکر کے علمبردار بھی پیدا ہوئے جن کو مسلمانوں کا اعتبار اور اعتماد حاصل تھا۔

علی گڑھ کا یہ ماحول تھا جس میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے مولانا فراہی ۱۸۹۱ء میں یہاں وارد ہوئے۔ وہ اسلامی علوم میں تکمیل کے بعد علی گڑھ آئے تھے۔ ان کے زمانہ طالب علمی کے بارے میں متعدد روایتیں مشہور ہیں جن سے واضح ہے کہ سرسید کو خود بھی ان علوم میں مولانا کے رسوخ کا اعتراف تھا۔ ان کے زمانہ طالب علمی ہی میں سرسید نے دینیات کے نصاب کے لئے دو کتابیں ان سے عربی سے فارسی میں ترجمہ کرائی تھیں۔ طبقات ابن سعد کے منتخب ابواب اور شبلی کی تالیف کردہ کتاب تاریخ بدء الاسلام کا فارسی ترجمہ یہاں دینیات کے نصاب میں شامل رہا۔ یہ اپنی نوعیت کا غیر معمولی واقعہ ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کالج میں داخلہ کے وقت مولانا کی علمی اور ذہنی سطح کیا رہی ہوگی۔ اس سلسلہ میں ایک بڑی اہم بات یہ ہے کہ ترجمہ طبقات ابن سعد کا سن اشاعت ۱۸۹۱ء ہے اور جیسا کہ معلوم ہے یہی سال مولانا کے کالج میں ورود کا بھی ہے۔

ایک ایسے ماحول میں جہاں دن رات یہی چرچے تھے ممکن نہ تھا کہ فراہی جیسا بالغ نظر اور حساس انسان اس سے متاثر نہ ہوتا۔ مولانا کی سوانح میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا لیکن اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اپنے قیام علی گڑھ کے دوران مولانا فراہی نے مسلمانوں کے ہمہ گیر زوال وانحطاط اور اس کے اسباب ومحرکات پر ضرور غور وفکر کیا ہوگا اور ساتھ ہی یہ بھی ضرور سوچا ہوگا کہ اس صورت احوال کی اصلاح کی کیا تدبیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوسکتی ہے۔ اس باب میں سرسید کی ہمہ وقتی کوششوں اور فکر مندی کے تناظر میں بھی یہ سوال بار بار ذہن و دماغ کو جھنجھوڑ تا رہا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ یہاں کے ماحول میں قدیم صالح کے ساتھ جدید نافع کی آمیزش نے ان کو مزید جلا بخشی، تاریخ اسلام پر ان کی گہری نظر تھی، قیاس کہتا ہے کہ یہ مطالعہ انہوں نے اپنے قیام علی گڑھ کے دوران ہی کیا ہوگا۔ ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ قیام علی گڑھ کے دوران درسی مصروفیات کے علاوہ مولانا کے زیر مطالعہ کون سی کتابیں رہتی تھیں۔ اگر اس طرح کی معلومات کی فراہمی کی کوئی صورت ممکن ہوتی تو مولانا کے ذہنی سفر کا خاکہ تیار کرنا کسی قدر آسان ہوجاتا۔ اس باب میں ٹھوس شہادت کے فقدان کے باوجود مولانا کی مستقبل کی مصروفیات اور ترجیحات کو سامنے رکھا جائے تو یہ نتیجہ نکالنے کی غالباً گنجائش موجود ہے کہ انہوں نے اپنی آئندہ زندگی کی سمت سفر اور مقاصد زندگی کا تعین، جس کے حصول کے لئے انہوں نے اپنی پوری زندگی وقف کردی، یہیں رہتے ہوئے کیا اور اس کے لئے ضروری تیاریاں بھی شاید یہیں کیں۔ مولانا کے دستیاب حالات زندگی میں اس مرحلہ میں کسی خاص غور و فکر اور ذہنی کشمکش کا سراغ نہیں ملتا لیکن، ہم سمجھتے ہیں کہ اس قیاس کے لئے کچھ بنیادیں ضرور موجود ہیں۔ ان سب کے نتیجہ میں مسلمانوں کی اصلاح اور ان کی زبوں حالی اور پسماندگی دور کرنے کے لئے جس میں ایک طویل اور پیچیدہ تاریخی عمل اور ردِ عمل نے انہیں لاگرایا تھا، جو نسخہ انہوں نے تجویز کیا وہ اس سے یکسر الگ اور مختلف تھا جو علی گڑھ تحریک کے عظیم المرتبت بانی نے اس مقصد کے لئے سوچا تھا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ روح عصر سے آگہی اور زمانہ کی رفتار کو سمجھنے کی ضرورت اور اہمیت کا واضح احساس ان میں بھی موجود تھا۔ غالباً یہ اسی احساس کا مظہر تھا کہ انہوں نے اپنے تجویز کردہ نصاب تعلیم میں ابتداء ہی سے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ دینی علوم حاصل کرنے والوں کے لئے انگریزی زبان سے واقفیت حاصل کرنا بھی ضروری ہو۔ اس باب میں بعض حلقوں کی طرف سے سخت مزاحمت کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باوجود وہ اس پر کسی طرح کی مصالحت کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ ایک باعزت زندگی کے لئے مناسب ذریعہ معاش کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ چنانچہ ان کے مجوزہ نصاب تعلیم میں اس بات پر بھی زور دیا گیا تھا کہ دوران تعلیم طلبہ کو کوئی ایسا ہنر بھی سکھایا جائے جو باعزت حصول معاش کی راہ ان کے لئے آسان کردے۔ ان امور کی ضرورت اور اہمیت کا احساس غالباً انہیں علی گڑھ سے تعلق اور وہاں قیام کے دوران جدید نظریات اور خیالات سے واقفیت کی وجہ سے ہی ہوا۔

یہ بات عموماً تسلیم کی جاتی ہے کہ مولانا نے قرآن مجید پر تدبر کا سلسلہ علی گڑھ میں قیام کے دوران شروع کیا۔ مقدمہ نظام القرآن میں وہ خود لکھتے ہیں کہ یہ اس زمانہ کا قصہ ہے جب وہ اپنی تعلیمی مشغولیتوں میں منہمک تھے۔ اس ضمن میں فطری طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ وہ کون سے عوامل اور محرکات تھے جو اس اہم فکری رجحان کے باعث بنے اور جو بالآخر ایک عظیم فکری انقلاب کا سبب بنا۔ فکر فراہی کے ایک طالب علم کے لئے یہ بات اساسی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ اس عظیم الشان فکری انقلاب کا نقطہ آغاز کیا ہے اور اس کی ابتدا کن حالات میں میں ہوئی اور وہ کون سے محرکات اور عوامل تھے جو اس کے لئے ذمہ دار تھے۔ یہ جاننا اس لئے ضروری ہے کہ کوئی فکر خلا میں پروان نہیں چڑھتا اور اس عالم اسباب میں ہر چھوٹے بڑے کام کے پیچھے کسی نہ کسی سبب کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ مزید براں افکار کے ارتقاء میں اس وقت کے حالات وظروف کا اثر پڑنا گزیر ہے۔

مولانا کے زمانہ طالب علمی میں ان کے بڑے بھائی اور استاد مولانا شبلی کے دورس قرآن کا بڑا شہرہ تھا۔ مولانا محمد علی جوہر کو انہیں دروس نے قرآن مجید پر غور وفکر کی طرف مائل کیا۔ یہ معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی قرینہ نہیں ہے کہ مولانا فراہی نے بھی کبھی ان دروس سے استفادہ کیا۔ مولانا شبلی اور مولانا فراہی دونوں کی داستان حیات اس موضوع پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔ مولانا فراہی کی سوانح حیات کی روشنی میں ان کی شخصیت کی جو تصویر ابھرتی ہے اور اس کی جو بنیادی خصوصیات سامنے آتی ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے پیش نظر شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ غور و فکر کا یہ پورا مرحلہ جس کے نتیجہ میں وہ ان نتائج تک پہونچے جن کی تکمیل اور حصول ان کا مقصد زندگی بن گیا، ان کے اپنے ذہن و دماغ کے نہاں خانوں تک محدود رہا ہوگا اور وہ اس سلسلہ میں غالباً کسی سے کسی طرح کی علمی اور فکری مدد اور رہنمائی کے طالب نہیں ہوئے۔ کالج کے ایک باصلاحیت طالبعلم کی حیثیت سے وہ وہاں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ لجنۃ الادب اور مجلس اخوان الصفا کے ممبر تھے۔ مولانا شبلی کو شمس العلماء کا خطاب ملا تو لجنۃ الادب کا ایک تہنیتی جلسہ منعقد ہوا۔ اس موقع پر مولانا فراہی نے ایک مرصع عربی قصیدہ پیش کیا۔ کون اندازہ کر سکتا تھا کہ ان کے ذہن و دماغ کی پہنائیوں میں ایک عظیم الشان فکری انقلاب کی بنیادیں استوار ہو رہی تھیں جس کے ذریعہ فہم قرآن کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہونے والا تھا۔

اس فکری انقلاب کی ابتداء، پس منظر اور اسباب و محرکات کے بارے میں تلمیذ فراہی مولانا امین احسن اصلاحی نے درج ذیل توجیہ پیش کی ہے۔ البتہ جیسا کہ فراہی کے سوانح نگار ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے توجہ دلائی ہے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ مولانا اصلاحی کا استنتاج ہے یا اس کے بارے میں انہوں نے مولانا فراہی سے کبھی کچھ سنا بھی تھا۔

"یہ وہ زمانہ ہے جب سرسید مرحوم مغربی نظریات سے مرعوبیت کے سبب سے قرآن مجید کی من مانی تاویلات کر رہے تھے اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جو انگریزوں کے لائے ہوئے افکار و نظریات سے مرعوب تھا، بری طرح ان من مانی تاویلات کا شکار ہو رہا تھا، مولانا نے اس فتنہ کو جہاں انگریزوں کے تسلط کا ایک قدرتی نتیجہ خیال کیا وہاں اس حقیقت پر بھی ان کی نظر گئی کی مذہبی علوم خصوصاً قرآن کے سمجھنے اور سمجھانے کا جو طریقہ مسلمانوں میں رائج اور مقبول رہا ہے وہ بالکل غلط اور فرسودہ ہے اور اس غلط اور فرسودہ طریقہ نے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو فکری اعتبار سے اس قدر کمزور اور منفعل بنا دیا ہے کہ وہ بڑی آسانی سے ہر فتنہ کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علاج اللہ تعالیٰ نے مولانا کے دل میں یہ ڈالا کہ قرآن پر غور کرنے کا وہ صحیح طریقہ اختیار کیا جائے جس سے حکمت قرآن کے دروازے کھلیں تاکہ مسلمان مغرب کی فاسد عقلیت سے مرعوب ہونے کے بجائے قرآن کی صالح عقلیت سے اس کا مقابلہ کر سکیں۔ چنانچہ مولانا نے تفسیروں کے واسطہ سے قرآن کے سمجھنے کا مقبول عام طریقہ چھوڑ کر قرآن پر براہ راست غور کرنے کا طریقہ اختیار کیا اور آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کی رہنمائی ان اصولوں تک فرمائی جو انہوں نے اپنے مقدمہ نظام القرآن میں بیان فرمائے۔"

بظاہر محسوس یہی ہوتا ہے کہ یہ مولانا اصلاحی کا استنتاج ہے۔ اس زمانہ میں علی گڑھ میں پائی جانے والی عام مذہبی اور علمی فضا کے بارے میں اپنے مطالعہ اور تجزیہ کے نتیجہ میں غالباً وہ اس نتیجہ تک پہونچے ہوں گے۔ اس بات کا بھی پورا امکان موجود ہے کہ صورت واقعہ بڑی حد تک ایسی ہی رہی ہو جیسی کہ مولانا اصلاحی سمجھتے ہیں اور مولانا فراہی کے قرآن میں تدبر و تفکر کا پس منظر اور محرکات یہی رہے ہوں۔ البتہ اس باب میں کسی حتمی نتیجہ تک پہونچنے سے پہلے یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ علی گڑھ تحریک کوئی مذہبی تحریک نہیں تھی بلکہ بنیادی طور پر وہ ایک تعلیمی اور سماجی اصلاح کی تحریک تھی۔ سرسید کے بعض قریبی رفقاء ان کی بہت سی تفسیری آراء سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ اس اختلاف رای کے باوجود سرسید سے ان کی گرویدگی ان کی قربانیوں، ان کے اخلاص اور مسلمانوں کے تئیں دردمندی اور دل سوزی کی وجہ سے تھی جس کے عملی مظاہر بار بار ان کے سامنے آتے رہتے تھے۔ مزید براں کالج کی مذہبی رہنمائی اور قیادت سرسید نے اپنے ہاتھ میں نہیں رکھی تھی بلکہ طبقہ علماء کے ایک اہم رکن مولانا عبداللہ انصاری شعبہ دینیات کے سربراہ تھے، مولانا دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور دارالعلوم کے بانی مولانا قاسم نانوتویؒ کے داماد تھے۔ اس باب میں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ سرسید نے اپنی کوئی کتاب کالج کے نصاب دینیات میں شامل نہیں کی اور نہ ہی یہاں کے طلبہ و اساتذہ کے دل و دماغ پر اپنی مذہبی آراء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو مسلط کرنے کی کوئی کوشش کی۔ اس لئے یہ تاثر کہ علی گڑھ کی مذہبی فضا سرسید کے تفسیری خیالات اور ان کے مذہبی معتقدات کے سانچے میں ڈھل گئی تھی کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اسی علی گڑھ میں مولانا شبلی کے درس قرآن کا بھی چرچا تھا اور بہت سے طلبہ بڑے ذوق و شوق سے اس میں حصہ لیتے تھے۔ اس زمانہ میں سرسید سے تمام تر تعلق خاطر کے باوجود ایسی کوئی شہادت دستیاب نہیں ہے کہ مولانا شبلی کے دروس سرسید کے تفسیری خیالات سے کسی درجہ میں بھی متاثر رہے ہوں اور کسی سطح پر بھی ان میں ان کا کوئی انعکاس پایا جاتا رہا ہو۔

سرسید کے سامنے بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے لئے جدید تعلیم کو ضروری خیال کرتے تھے اور مسلمانوں کے درمیان اس کی توسیع کے لئے بھرپور کوشش بھی کر رہے تھے۔ ساتھ ہی وہ مذہب کے دامن کو بھی مضبوطی سے تھامے رہنا چاہتے تھے۔ ۱۸۷۶ء میں جب کہ ابھی مدرسۃ العلوم کی تاسیس کو دو سال بھی پورا نہیں ہوا تھا انہوں نے وہاں کے طالب علموں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ اسی پر یقین رکھنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا۔ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہو گے اور جبھی ہماری قوم کی عزت ہو گی۔" لیکن اس خواہش اور کوشش کے باوجود وہ دیکھ رہے تھے کہ اس تعلیم کے باعث تعلیم یافتہ طبقہ میں مذہب کے بارے میں شبہات پیدا ہو رہے ہیں اور ان کے اوپر اس کی گرفت کمزور پڑ رہی ہے، چنانچہ تفسیر قرآن لکھنے کا منصوبہ انہوں نے اسی لئے بنایا کہ انگریزی تعلیم سے اسلام کے حق میں جن مضر نتائج کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا ان کا تدارک کیا جائے اور مذہب کے بارے جدید سائنس جو شبہات پیدا کر رہی تھی ان کے تسلی بخش جوابات فراہم کئے جائیں۔ سرسید نے یہ تفسیر خاص طور سے اسی طبقہ کو پیش نظر رکھ کر لکھی اور دوسرے طبقات کے درمیان اس کے شیوع کو پسند نہیں کرتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس تجزیہ کا یہ موقع نہیں ہے کہ سرسید کی تفسیر اپنی بہت سی شاذ رایوں، کمیوں اور لغزشوں کے باوجود اس مشن کو پورا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئی جس کے لئے وہ لکھی گئی تھی۔ البتہ یہ تاثر کہ ''مسلمانوں کا وہ طبقہ جو انگریزوں کے لائے ہوئے افکار و نظریات سے مرعوب تھا وہ بری طرح ان من مانی تاویلات کا شکار ہو رہا تھا'' مبالغہ آمیز ہے۔ دراصل یہ تفسیر اسی طبقہ کے ذہن و دماغ میں مذہب کے بارے میں اٹھنے والے شکوک و شبہات کے انسداد کے لئے لکھی گئی تھی اور بعض ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس خاص میدان میں اسے کامیابی بھی ملی۔ سرسید کی بہت سی تفسیری رایوں سے اس وقت بھی اختلاف کیا گیا اور آج بھی ان سے اتفاق ممکن نہیں ہے لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ جس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے اس مشکل کام کا بیڑا اٹھایا تھا اس کی شدید اہمیت کے باوجود کسی اور نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ چنانچہ جہاں یہ ضروری ہے کہ سرسید کی غلطیوں کی نشان دہی کی جائے اور اس باب میں ان کی ان لغزشوں سے اختلاف کیا جائے وہیں اس بات کا بھی اعتراف کیا جائے کہ انہوں نے وقت کی ایک بڑی مذہبی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی تھی۔

حالات کے اس تناظر میں غالباً یہ نتیجہ نکالنے کی گنجائش موجود ہے کہ علی گڑھ میں اپنے زمانہ طالب علمی میں مولانا فراہی کے تدبر قرآن میں دلچسپی لینے کے پیچھے بنیادی محرک اس زمانہ میں علی گڑھ میں پایا جانے والا وہ ماحول اور وہ عمومی فضا تھی جس میں مسلمانوں کے ہمہ گیر زوال اور انحطاط کا ذکر اور اس سے ان کو نکالنے کی فکرمندی عام تھی۔ فراہی جیسی بالغ نظر اور حساس شخصیت اس ماحول اور فضا سے یکسر لاتعلق نہیں رہ سکتی تھی۔ حالات اور قرائن کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا غالباً دور کی کوڑی لانے کے مترادف نہیں ہوگا کہ علی گڑھ میں قیام کے دوران انہوں نے بھی ان مسائل پر سوچنا شروع کیا اور دھیرے دھیرے یہ سوچ گہرے غور و فکر میں بدل گئی۔ اس غور و فکر کے ارتقائی مراحل کیا تھے؟ کتنے ذہنی اور فکری مرحلوں سے گذرنے کے بعد وہ اس نتیجہ تک پہونچے جو بالآخران کا مقصد زندگی بن گیا۔ یہ سب کچھ جاننے کے لئے ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ہم صرف یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ بہت طویل اور گہرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غور وفکر کے بعد اس نتیجہ تک پہونچے ہوں گے اس لئے کہ محرکات اور عوامل کی یکسانیت کے باوجود وہاں کے دانش وروں اور مصلحین نے ملت کی اصلاح اور ترقی کے لئے جو نسخہ تجویز کیا تھا مولانا کا تجویز کردہ خاکہ اس سے یکسر الگ تھا۔ یہ فکر ان کے ذہن ودماغ کے نہاں خانوں میں دیکھنے والوں کی نظروں سے دور دھیرے دھیرے صورت پذیر ہوتا رہا اور برسوں بعد کراچی کے دوران قیام میں اس کے پہلے نتائج سامنے آئے اور جب تک اس کے اولین ثمرات سامنے نہیں آ گئے کسی کو بھی، یہاں تک کہ مولانا شبلی کو بھی، یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس پرسکون اور خاموش سطح آب کے نیچے کیسا زبردست طوفان کروٹیں لے رہا تھا۔

یہ فکری انقلاب سرسید کے تفسیری نظریات کا ردِ عمل نہیں تھا بلکہ ایک مثبت فکری تسلسل کا نتیجہ تھا۔ ردّ عمل بالعموم افراط یا تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ ردّ عمل میں یک گونہ جذباتیت کا بھی دخل ہوتا ہے۔ سرسید کی تفسیر کے ردّ عمل میں تفسیریں بھی لکھی گئی اور بہت سی تحریریں بھی منظر عام پر آئیں۔ ان کے اندر ان خصوصیات کا بھرپور انعکاس پایا جاتا ہے۔ مولانا فراہی کی متین اور متوازن تحریروں میں ایسی کسی چیز کا پتہ نہیں ملتا۔ یہ ضرور ہے کہ قرآن فہمی کے میدان میں عہد حاضر کا یہ انقلابی فکر جسے اب بالعموم فکر فراہی کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے اور جس کے جملہ امکانات اور مضمرات ابھی پوری طرح سامنے نہیں آ سکے ہیں، اس کی تحریک علی گڑھ میں ہوئی اور یہیں رہتے ہوئے اس نابغہ روزگار کے ذہن ودماغ میں اس کے اولین نقوش صورت پذیر ہوئے۔ اگر پوری صورت حال کو سامنے رکھا جائے تو شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے بہت سے شذوذ کے باوجود سرسید کی تفسیر نے اس سلسلہ میں کسی حد تک مثبت کردار ادا کیا ہوگا کیونکہ مولانا فراہی کے فکری منہاج کے بعض اجزاء ترکیبی جو ان کی تحریروں میں اپنے منتہاء کمال پر نظر آتے ہیں ان کے ابتدائی نقوش سرسید کی تفسیر میں موجود ہیں۔

(۱۷ اگست ۲۰۰۸ء)

☆/☆

© rasailojaraid.com